

# مسلمانوں کی موجودہ قومی سیرت کے بعض کمزور پہلو

(انجناب مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی)

مسلمانوں پر تنقید کرنا اور ان کے کمزور پہلوؤں کو نمایاں کرنا کسی مسلمان کے لیے قطعاً کوئی خوش گوار کام نہیں ہے اور اس کے لیے کوئی شخص آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا، لیکن دنیا کے سبب فروری کام خوشگوار نہیں ہوتے۔ ایک ایسی جماعت کی کمزوریوں کو خاموشی سے دیکھتے رہنا جس سے نہ صرف اس کی اپنی قسمت بلکہ دنیا کی قسمت بھی متاثر ہے اور جو انجیل کی زبان میں زمین کا نمک ہے جس کی نگیلی کے ضائع ہو جانے کے بعد پھر زمین کو کوئی چیز نگیل نہیں کر سکتی، ایک ایسا ناخوش گوار کام ہے جس کے مقابلہ میں دنیا کی ہر ناگواری، ہر ٹمچی، ہر طرح کی روحانی اذیت اور ہر قسم کی ذہنی کوفت نتیجہ ہے، اور اس کے مقابلہ میں اپنی یاد دوسروں کی یہ ناخوش گوار کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

مسلمانوں کی کسی قوم یا ملک کا سلطنت و اقتدار سے محروم ہو جانا، یا مسلمانوں کا عالمگیر سیاسی زوال بہت بڑا حادثہ ہے جس پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اس کے جو اخلاقی اور ذہنی نتائج ہوتے ہیں، وہ بھی اب کچھ پوشیدہ نہیں رہے۔ لیکن اس سے بدرجہا افسانہ کا حادثہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی ذہنیت یا نفسیت کسی ایسے سانچے میں ڈھلنے لگے جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت کا سانچہ نہیں ہے، اور بعض انفرادی عیوب ناقص یا منکر خدا اور منکر آخرت قوموں کے صفات و خصائص مسلمانوں کی سیرت کا جز بنے لگیں اور قومی گیر کٹر کی صورت اختیار کرنے لگیں۔ تحریف دین کی اصطلاح تو پہلے سے موجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ عملي کوتاہیوں اور ذاتی انحراف سے بڑھ کر کوئی جماعت اصل دین، اس کی کتابوں اور اس کی تعلیمات میں ترمیم و تفسیح اور دو بدل شروع کر دے۔ اس کے نتائج انحراف سے کہیں بڑھ کر خطرناک اور وسیع ہوتے ہیں، اور اس کا علاج اور اس صورت حال کی اصلاح تقریباً محال ہوتی ہے، اس لیے کہ اس

تحریف سے اس قوم کے ذہن میں حقائق بدل جاتے ہیں، گناہ عین صواب اور بعض اوقات کارِ ثواب بن جاتا ہے اور ان کو دین کی اصل و حقیقت سے ہٹ جانے یا دور پڑ جانے کا احساس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہی عین دین معلوم ہوتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں میں مذہبی طور پر یہی صورت پیش آئی ہیں اس تحریف دین کے مقابلہ میں اس ذہنی و اخلاقی تبدیلی کو جو ہندوستان کے مسلمانوں میں نظر آرہی ہے تحریفِ مسلمین سے تعبیر کروں گا۔ مسلمانوں میں غلطی کو تاہمیاں کم و بیش ہمیشہ پائی گئیں اور انسانوں کی کسی جماعت کا ان سے یکسر پاک ہونا بہت مستبعد ہے۔ لیکن یہ انحراف تھا۔ مسلمان اس کو غلط سمجھتے رہے اور اسلامی ذہن و ضمیر ہمیشہ اس کے خلاف احتجاج کرتا رہا، اور کبھی مسلمانوں نے اس پر فخر نہیں کیا۔ لیکن اب جو کچھ نظر آرہا ہے اس کو انحراف کہنا مشکل ہے، وہ اس سے کچھ زیادہ وسیع اور عمیق اور اس سے مختلف شکل رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانوں کے تمام سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی مسائل سے زیادہ اہم اور قابل توجہ ہے۔ قومی گیر کٹر قوم کی زندگی میں اس کی مادی دولتوں سے کہیں بڑھ کر بیش قیمت ہوتا ہے۔ بالخصوص مسلمانوں کی اسلامی سیرت، بڑی سے بڑی اسلامی سلطنت اور بڑے سے بڑے قومی ادارہ اور زیادہ سے زیادہ قومی ترقی اور اقتصادی خوش حالی سے زیادہ قیمت رکھتی ہے۔ کسی بڑی سے بڑی قیمت اور عظیم سے عظیم بدل پر بھی اس کے نقصان یا زوال کو گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اس پر زوال آگیا یا اس میں کچھ غلط تبدیلی واقع ہوگئی تو بڑی سے بڑی مادی کامیابی اور فتح سے اس کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تبدیلی مختلف تاریخی و سیاسی، تعلیمی و تہذیبی اسباب، بعض موثر اور اشتعال انگیز حالات و واقعات اور زیادہ ترقیات کی کمزوری سے صدیوں میں پیش آتی ہے۔ لیکن جب بدقسمتی سے یہ تبدیلی واقع ہو جاتی ہے تو صدیوں تک اس کا اثر قائم رہتا ہے اور اس کے اخلاقی و اجتماعی نتائج اس قوم کے تمام افراد کو برداشت کرنے پڑتے ہیں خواہ انفرادی طور پر بعض افراد کتنے ہی نیک سیرت ہوں۔

اس موقع پر چند نمایاں کمزور پہلوؤں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دینی و اخلاقی حیثیت سے زیادہ اہمیت

رکھتے ہیں اور جن کو اصل اسلامی سیرت اور اخلاقی تعلیمات سے زیادہ بُعد اور تعارض ہے۔

(۱) ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر واقع ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا چلا جا رہا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر یا مستقلاً اصول اور صداقت کے مقابلہ میں منافع و مصالح، آج کل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے مسلمان ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول ناقابل اعتبار ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اُس وقت شروع ہوئی جب ہندوستان میں اور تقریباً تمام اسلامی ممالک میں (جو کسی طرح یورپ کے زیر اثر آئے) مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ اخلاق اور مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالب علم اور اس زمانہ کا ہر واقعہ آدنی جاننا ہے کہ یورپ کا سارا نظام زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ "افادیت" اور "مصلحت بینی" اس نظام زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ سارا یورپ اُس وقت سے جب سے اس نے کلیسا کے اقتدار سے اپنے کو آزاد کر لیا صرف ایک ہی علی مذہب رکھتا ہے (جس کے خلاف کسی گوشہ میں بھی عملاً کوئی بغاوت نہیں) اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔ مسلم ممالک میں اس نظام کے غلبہ کا طبعی نتیجہ یہ ہے کہ آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوئے بعض حلقوں میں جہاں یہ نظام اپنی پوری روح کے ساتھ مستولی ہے، معدوم ہو گئی ہے۔ دنیاوی ترقی اور مادی فوائد و منافع متہمائے نظر بن گئے ہیں، اصولی و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلہ میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی (یعنی دنیاوی ترقی) پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلا ارادہ آخرت اور امور آخرت کی اہمیت کم ہو گئی، بلکہ بعض اوقات انہوں نے اس نظام اور ان افکار کی تفسیح و تہقیق

کی جس میں دنیا کے مقابلہ میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی تھی اور مسلمانوں کو دنیا پرست اور آخرت سے غافل ہونے سے روکنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان جلوں اور ان تقریروں اور تحریروں کا مذاق اڑایا گیا اور ان کی ہجو کی گئی جن میں دنیا کو متاعِ قلیل اور متاعِ غرور کہا گیا تھا۔ دنیا پرست ، مادہ پرست اور منکرِ آخرت قوموں اور ملکوں (غالباً صحیح تو ایک قوم اور ملک) کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیارِ کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو بہتر تقدیر سے بالاتر تھا۔ پھر جو نظامِ تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکا آخرت کی روح بسی ہوئی تھی، اس کی اساس، اخلاق کے مقابلہ میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی تھی، اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلہ میں خواہشِ نفس اور لذت کا عنصر غالب تھا، وہ تمام تر ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار تھا جو سزا پامنکرِ آخرت تھی۔ دراصل یہ کسی مجرور نظامِ تعلیم کی قبولیت کی دعوت نہ تھی اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفہٴ اجتماع کی دعوت تھی۔

پھر اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ انھوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا کہ

”چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی“

اور ۶ ”زمانہ باتونہ ساز و دو با زمانہ بساز“

اس دعوت و تبلیغ میں مسلمانوں کی بہترین قابلیتیں صرف ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی نظروں میں اصول و اخلاق کی اہمیت بند بچ گھٹی چلی گئی اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا جس کے نزدیک اخلاق و مصالح میں کوئی تقابل نہ تھا اور ہر موقع پر مصلح کو اصول پر ترجیح حاصل تھی۔ وہ ہر وقت بڑے سے بڑے مذہبی اصول، شرعی حکم اور اخلاقی تعلیم کو ایک شخص ہی منفعیت یا قومی مصلحت پر قربان کرنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک خاص قسم کی محدود معاشی ترقی کے ساتھ ایک عام اخلاقی انحطاط اور بے اصولی پھیل گئی۔ بیسویں صدی کے اس نصفِ اول میں ہندوستان میں ہمیں مسلمانوں کے کیر کڑھیں

پہلے کے مقابلہ میں نمایاں اور محسوس انحطاط نظر آ رہا ہے، جو ہر سوچنے سمجھنے والے مسلمان کے لیے حد درجہ تشویش ناک ہے۔ اب ایک اصول اور مذہبی اعتقاد کے مقابلہ میں ذاتی ترقی یا شخصی فوائد کی قربانی کی مثالیں کم سے کم نظر آتی ہیں اور وہ بھی زمانہ گذشتہ کی یادگاریں ہیں جو برابر رونبر وال ہیں۔ اب تمام مسائل زندگی پر ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا طرِ قی فکر اور زاویہ نگاہ خالص مادہ پرستانہ اور تاجرانہ ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کام میں اس کے لیے کتنی مالی منفعت ہے یا اس کو کس قدر جاہ و غزاز حاصل ہوگا اس بات سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ وہ شرعاً اس کے لیے جائز اور اخلاقاً مستحسن ہے یا نہیں بلکہ اس کا اپنا خمیر بھی اس سے مطمئن ہے یا نہیں۔ یہ سوالات مسلمانوں کے دماغوں سے ایک عرصہ سے بالکل نکلنے جا رہے ہیں یا ان کی اہمیت کم ہو گئی ہے اور ان کی بنا پر کسی مسلمان کو کسی عہدہ یا منفعت یا اعزاز کے قبول کرنے میں قلب و ضمیر کی رکاوٹ کم سے کم پیش آتی ہے خواہ وہ شرعیت میں مطلقاً حرام اور اخلاقاً حد درجہ معیوب ہو اور اس کا خمیر ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے مطمئن نہ ہو۔ بلکہ اب اس کو ایک قومی خدمت سمجھا جاتا ہے اور اسی نقطہ نظر سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جو روپیہ کسی جائز یا ناجائز طریقہ پر کسی فرد کی جیب میں آتا ہے اور اس کے بچوں اور متعلقین کی خوش حالی کا سبب بنتا ہے وہ گویا قومی فنڈ میں جمع ہوتا ہے اس لیے کہ یہ سب مسلمان ہیں اور ایک مسلمان کی خوش حالی یا چند افراد کی خوش حالی خواہ وہ کسی قدر دولت و احکام مذہب کی صریح مخالفت کے بعد ہی ہو قومی خوش حالی کے مرادف ہے۔

اس ذہنیت و سیرت اور اس عام اخلاقی انحطاط اور کیرنٹر کی کمزوری کا اثر مسلمانوں کی زندگی کے تمام شعبوں پر پڑ رہا ہے اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا، بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی بہت کم رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہ عام بے اصولی، تناقض اور اخلاقی کمزوریاں ہیں جن کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ ہمارے مسلمان اخبار و رسائل میں (الا ماشاء اللہ) ہر قسم کا خلاف تہذیب اشتہار شائع کرایا جاسکتا ہے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے۔ اپنی رسائل میں ہر قسم کے مخرب اخلاق،

جیسا سوز و غم یا مضمون، افسانے، اشعار شائع ہو سکتے ہیں، بے حیائی اور اخلاقی بے نظمی کی ہر تحریک کے لیے وہ آئینہ بن سکتے ہیں، بدتر سے بدتر فواحش کی اشاعت ان کے ذریعہ سے کی جاسکتی ہے اگر ان کو اس راستہ سے اپنے رسالہ کی کامیابی اور مقبولیت کا ایک فی صدی بھی امکان نظر آئے تو ایسی صورت میں وہ اس کی ہرگز پروا نہ کریں گے کہ ان کی اس حرکت سے خلق خدا کی اخلاقی اتری اور انحطاط کا ۹۹ فی صدی امکان ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان اخبارات و رسائل کے مالک و ایڈیٹرز ذاتی طور پر نثرین مسلمان ہوں، اور وہ ہوں ان چیزوں کو اچھا نہ سمجھتے ہوں لیکن اگر آپ اس مسئلہ پر ان سے گفتگو کریں گے تو وہ صاف کہیں گے کہ تجارت و صحافت میں اصول، مذہب اور اخلاق کی پابندی نہیں کی جاسکتی۔

اخبارات کسی اصول اور صحیح مسلک کی ترجمانی اور صحیح خیالات و افکار کی اشاعت کے بجائے اپنے قارئین اور عوام کے خیالات و خواہشات کی ترجمانی کو اصول صحافت سمجھتے ہیں۔ وہ عوام کی ناراضی اور بدولی کو ایک منٹ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ان کی خوشی اور اپنے اخبارات کی مقبولیت و اشاعت کے لیے ہر قسم کی بے اصولی، ہر طرح کے تناقض اور ہر درجہ کے ابتذال کو گوارا کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذاق سلیم، فکر صحیح اور اخلاق قومی پر یہ اخبارات بڑی طاقت کے ساتھ اثر انداز ہیں اور مسلمانوں کے افکار و خیالات میں جو عام بے ربطی و تناقض، عام ذہنی انتشار اور اشتعال پذیر مہی پائی جاتی ہے اس میں میرے نزدیک ان اخبارات کا بڑا حصہ ہے۔

مسلمان اہل علم اور اہل قلم کو آپ ہر کام پر لگا سکتے ہیں اگر اس کا خاطر خواہ معاوضہ آپ ان کو ادا کریں۔ ان سے خود ان کے خیالات و افکار کے خلاف سب کچھ کہلوا سکتے ہیں، لکھوا سکتے ہیں اور شائع کروا سکتے ہیں اگر اس کی قیمت ادا کر سکیں۔ بڑے بڑے تجزیہ اور ذی علم اہل قلم و اخبار نویس اور پُر جوش اسلامی قلمیں لکھنے والے شاعروں سے ایسے پروپینڈے کے کام لیا جاسکتا ہے جس سے وہ خود بھی متفق نہیں ہیں۔ اگر آپ ان سے اس بارہ میں استفسار کریں گے تو وہ آپ کو جواب دیں گے کہ اس میں کوئی نکتہ نہیں

یا قومی نقصان یا شرعی گناہ ہے یہ تو ایک بڑی بات ہے۔ ایک شخص ہم کو معاوضہ دیتا ہے اور ہم اس کے بدلے میں اسے ایک تقریر یا مضمون تیار کر دیتے ہیں۔ گویا ضمیر فرشتی بھی ایک شریفانہ تجارت ہے اور تعاون علی الاثر والعدوان (گناہ اور زیادتی پسند کرنا) خود کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ یہ دعائیہ و ذمہنی بیسوائی اس بیسوا عورت کے گناہ سے بدتر ہے جو اپنا جسم کرایہ پر چلاتی ہے۔

جب سے مسلمانوں پر مغربی طرز کی قومیت کا غلبہ ہوا ہے وہ ہر چیز کو قومی ترقی اور قومی مفاد کے نقطہ نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ اور جن چیزوں کا ارتکاب وہ ذاتی سر بلندی اور شخصی منفعت کے لیے کرتے تھے اب اس کو قومی مفاد کے لیے ضروری سمجھنے لگے ہیں۔ مثلاً اب ان کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ تمام محکموں اور شعبوں میں ان کا تناسب قائم رہے خواہ وہ آبکاری کا محکمہ ہو یا جاسوسی کا، سودی کاروبار کے نظام ہوں یا فی سبیل الشیطان لڑنے والے نظام غضب یہ ہے کہ وہ کام بھی جس کی حرمت مسلمانوں کے لیے قرآن کی نص قطعی سے ثابت ہے اور جس پر قرآن کی یہ دو آیتیں شاہد ہیں:

لَا الَّذِينَ تَوْفِقُهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَائِفِي أَنْفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنْتُمْ قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا فَأُولَئِكَ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيرًا۔ (انسار)

الَّذِينَ آمَنُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ الطَّاغُوتِ فَقَاتِلُوا أَوْلِيَاءَ الشَّيْطَانِ إِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيفًا (انسار)

اس کو اسی قومی مفاد اور مسلمانوں کے تناسب اور ان کے قومی تفوق کو برقرار رکھنے کے لیے جائز قرار دیا گیا اور بعض مسلمانوں ہی کی کوشش سے اس میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور ہو رہی ہے۔

ان تمام مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک اصول و صداقت پر مفاد و مصالح مقدم ہیں۔ اخلاقی معیار اور اخلاقی حقیقتیں ان کی نگاہ میں وقع نہیں۔

اصل چیز وہ منافع اور فوائد ہیں جن کا حصول اپنی ذات، خاندان، یا قوم کے لیے ضروری یا فائدہ مند سمجھا جاتا ہے۔ یہ ذہنی کیفیت اور سیرت ایک ایسی ملت کے لیے جو پیغمبروں کی تعلیمات اور اصول کی حامل و امین ہے اور اصول و اخلاق، سیرت و کردار میں تمام دنیا کے لیے نمونہ و شاہد ہے (وَكَانَ إِلَهُنَّ جَعَلْنَا كُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِنَكُونُ دُؤَا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ) حد درجہ نامناسب اور غیر مطابق ہے اگرچہ ایک خالص قوم کے لیے بالکل مناسب و عین مطابق ہے، اور اس کا مسلمانوں کو فیصلہ کرنا چاہیے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے؟

یہ ذہنیت و سیرت ہمارے علم میں کم سے کم ہندوستان میں اس بچپن میں برس کے عرصہ میں نمایاں ہوئی ہے اور اس کو بڑا فروغ اس مغربی قوم پرستی اور موجودہ سیاسی جوش اور دفاعی جذبہ نے دیا ہے جو ان پچھلے برسوں میں مسلمانوں میں پیدا ہوا ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انھوں نے اصول و اخلاق پر بڑے بڑے مصالحوں و منافع کو ہمیشہ قربان کیا اور ایک اخلاقی اصول یا دینی حکم کی حفاظت کے لیے انھوں نے عظیم الشان سیاسی و معاشی فوائد کو ٹھکرا دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جبکہ کے معاملہ میں ٹھیک یہی طرز عمل اختیار کیا تھا جسے ایک خالص قوم پرست کے نقطہ نظر سے ایک بڑی سیاسی غلطی کہنا چاہیے۔ صرف ایک شرعی حکم (قصاص) اور ایک دینی اصول (مساوات) کے قائم رکھنے کی خاطر ان کو جبکہ جیسے بااثر وائی ریاست اور غسان جیسے طاقتور قبیلہ کی امداد سے دستبردار ہونا پڑا مگر انھوں نے اس کے لیے اصول میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جبکہ سے ہزار درجہ بڑھ کر طاقتور فرماں روا اسلام کے حلقہ بگوش ہوئے، غسان سے ہزار درجہ بڑی ریاستیں اسلام کے اثر میں آئیں اور شریعت اسلامی میں کوئی تحریف نہیں ہو سکی،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کسی سیاسی مصلحت کی خاطر اپنی درجہ کی بھی بے اصولی اور اخلاقی معیاری سے انحراف قبول نہیں کیا اور اس کے لیے وہ تمام مشکلات قبول کیں جو ان کو اپنی خلافت میں پیش آئیں



مگر نظام خلافت میں انھوں نے کوئی تحریف نہیں ہونے دی۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو کوئی سیاسی مصلحت اور قومی مفاد ایک ایسے نظام حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ نہ کر سکا جو ان کے نزدیک غلط اور ان کے اعتقاد و اصول کے خلاف تھا۔

ابھی نصف صدی پہلے جب مغربی تہذیب اور مغربی افکار ہندوستان میں مقبول نہیں ہوئے تھے ہندوستانی مسلمانوں کا لیر کٹر اتنا مضبوط تھا کہ اعلیٰ قسم کے دینداروں کے علاوہ متوسط درجہ کے با اصول اور وضو دار شرفا بھی جھوٹ بولنا، اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کوئی کام کرنا یا کچھ کہنا کفر سے کم نہیں سمجھتے تھے اور مر جانے کو اس پر ترجیح دیتے تھے۔ ہدایوں کے ایک بزرگ (غالباً مولوی رضی الدین صاحب) شہ کے ہنگامہ میں ماخوذ تھے۔ کلکٹر پانچ ان کا شاگرد تھا۔ اس نے ہزار کوشش کی کہ مولوی صاحب ایک مرتبہ اپنی زبان سے جرم کا انکار کر دیں تو وہ ان کو صاف بری کر دے گا۔ لیکن انھوں نے آخر وقت تک جھوٹ بولنے اور اپنے ضمیر اور اعتقاد کے خلاف کچھ کہنے سے انکار کیا اور سزائے موت قبول کی۔

مولانا محبوب علی صاحب دہلوی نے ہندوستان کی مشہور تحریک جہاد (حضرت سید احمد شہید و مولانا اسماعیل شہید کی تحریک) میں کچھ اختلاف کیا، بعد میں انگریزوں نے ٹو گاؤں صلہ میں دینے چاہے مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ یہ میرا جہاد تھا۔ میں نے کسی مصلحت سے اختلاف نہیں کیا تھا۔ یہ سینکڑوں ہزاروں میں سے دو مثالیں تھیں۔ شریف خاندانوں اور شرفا کی بستوں میں جا کر پوچھے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں آپ سنیں گے۔

سیرت کی صلابت، اخلاق کی استقامت اور اصول کی پابندی کی ان مثالوں کا مقابلہ اس زمانہ کی بے اصولیوں اور اخلاقی کمزوریوں، ضمیر فریبوں اور مسلک و خیالات کی نیرنگیوں سے کیجیے، تو آپ کو اس عام قومی انحطاط اور اخلاقی زوال کا اندازہ ہوگا جو مسلمان قوم میں نظر آ رہا ہے اور وزیر و سرعرت کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کا وہ تاریک پہلو ہے جس کو دیکھ کر ایک حساس مسلمان

دل خون ہوتا ہے اور وہ اس تلخ نوائی پر مجبور ہو جاتا ہے جو اس کے لیے اور پڑھنے والوں کے لیے کوئی خوش گوار چیز نہیں۔

اخلاق و سیرت اس امت کے نظام جسم میں قلب کا درجہ رکھتے ہیں۔ لوگ تنومند و فرجہم کو دیکھ کر اس جسم کی صحت و طاقت کا حکم لگا دیتے ہیں، اور یہ نہیں دیکھتے کہ قلب کس قدر کمزور اور ماؤف ہے اور کس طرح بتدریج اس کی حرکت بند ہو رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کا اندازہ مردم شماری کے اعداد ان کے قومی جوش اظہاری تنظیم اور سرکاری عہدوں کے تناسب سے لگانا بالکل غلط ہے۔ ایک با اصول دنیا کے لیے ایک پیغام رکھنے والی، اور اخلاق و سیرت میں دنیا کی تمام قوموں کے لیے معیار بننے والی امت کی پیمائش کا ہرگز یہ صحیح پیمانہ نہیں۔ ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اخلاق و اوصاف جو زندگی کے صحیح عناصر ہیں، اور جن سے اس امت کا شخص و امتیاز ہے وہ رو با نخطا ہوں یا رو بترقی۔ اور اس کا اندازہ سرکاری کاغذات سے نہیں ہو سکتا، بلکہ مسلمانوں کی عام زندگی اور ان کے اقوال و افعال سے ہو سکتا ہے۔

بقول اکتبر مرحوم:

نقشوں کو تم نہ جانچو لوگوں سے بل کے دیکھو

کیا چیز جی رہی ہے، کیا چیز مر رہی ہے

(باقی)